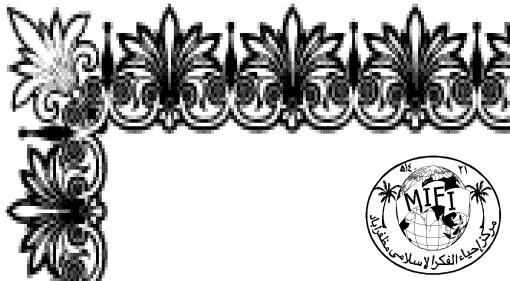

تذکرہ

حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ

یعنی حضرت علامہ کے حالات، تعلیم وتربیت کے واقعات، زندگی کے مختلف گوشے، سلوک وطریقت، اہل علم کا اعتراف اوران کے علمی وتاریخی کارناموں اورزعماء ملت کے تأثرات کا ایک علمی مرقع وتاریخی دستاویز۔

تالیف

مولانا قاری مفتی محمد مسعود عزیزی ندوی

رئیس مرکز احیاء الفکر الاسلامی مظفرآباد، سہارنپور

ناشر

دار البحوث والنشر

مرکز احیاء الفکر الاسلامی مظفرآباد، سہارنپور (یوپی)

حامداً ومصلیاً

سلسلہ مطبوعات مرکز احیاء الفکر الاسلامی.....(۳۰)

نام کتاب: تذکرہ حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ

تالیف: مولانا قاری مفتی محمد مسعود عزیزی ندوی

صفحات: ۴۰/

تعداد: ۱۱۰۰/

قیمت: ۱۰/روپئے

باہتمام: حافظ عبدالستار عزیزی

سن اشاعت..... ۲۰۱۳ء م ۱۴۳۴ھ

کمپوزنگ: عزیزی کمپیوٹر سینٹر مرکز احیاء الفکر الاسلامی، مظفرآباد، سہارنپور

ناشر

دار البحوث والنشر

مرکز احیاء الفکر الاسلامی مظفرآباد، سہارنپور، یوپی (انڈیا)

E-mail: masood_azizinadwi@yahoo.co.in
Mob. 09719831058

ملنے کے پتے

☆ کتب خانہ یحیوی متصل مظاہر علوم سہارنپور ☆ خانقاہ رحیمیہ رائے پور، سہارنپور (یوپی)

☆ دار الکتاب، دیوبند سہارنپور (یوپی) ☆ مکتبہ ندویہ، دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

☆ اتحاد بک ڈپو، دیوبند، سہارنپور ☆ الفرقان نیا گاؤں مغربی (نظیرآباد) لکھنؤ

فہرست مضامین

پیش لفظ ۴
حرفے چند ۵
تمہید ۷
اسم مبارک اور وطن ولادت ۸
سلیمان کی وجہ تسمیہ ۹
لفظ ندوی جزو نام کیوں بنا؟ ۱۰
تعلیم وتربیت ۱۲
عطائے سند اور آغاز شہرت ۱۳
علمی کاموں کا آغاز ۱۵
مختلف علمی وتعلیمی کام ۱۷
شکوۂ سلیمانی ۲۱
اضطراب روحانی ۲۲
انتخاب شیخ ۲۴
بیعت وسلوک وطریقت ..... //
زندگی کے مختلف گوشے ۲۵
دیوبند اور علی گڑھ کا اعتراف ۲۶
حسن اخلاق ۲۷
علمی وتاریخی کارنامے ۲۹
دور علالت ۳۴
رحلت حضرت علامہ ..... //
شام وداع کا منظر ۳۵
زعمائے قوم وملت کے تأثرات ..... //

بسم اللہ الرحمان الرحیم

پیش لفظ

حضرت مولانا ڈاکٹر سید سلیمان ندوی

ڈربن یونیورسٹی، جنوبی افریقہ

تذکرہ حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ کے مصنف مولانا قاری مفتی محمد مسعود عزیزی ندوی کے اصرار پر چند سطریں پیش لفظ کے طور پر پیش ہیں، مجھے کچھ تامل تھا، کیونکہ کسی کا اپنے والد کے بارے میں کچھ لکھنا خود ایک مشکل مرحلہ ہوتا ہے؛ لیکن قاری محمد مسعود عزیزی ندوی صاحب کا اصرار میرے تامل پر غالب آیا۔

تذکرہ میں مصنف نے معتبر مآخذ سے والد ماجد کے حالات جمع کئے ہیں اور سلیقہ سے ان کو ترتیب کے ساتھ یکجا کیا ہے، رسالہ اگرچہ مختصر ہے، مگر سب ہی قابل توجہ امور اس میں جمع ہیں، بزرگوں کی سوانح عمریاں اور ان کی زندگیوں کی سرگزشت اس لئے لکھی جاتی ہیں کہ قارئین ان سے نفع حاصل کریں اور اپنی زندگیوں کو سنواریں، صحیح رخ پر ڈھالیں اور سبق حاصل کریں، اللہ تعالی سے دعا ہے کہ یہ رسالہ پڑھنے والوں کے لئے نافع رہے گا۔

۱۰/دسمبر ۲۰۱۲ء — سید سلیمان ندوی

حال مقیم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ — دربن، جنوبی افریقہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرفے چند

زندگی میں نئی امنگ، نیا جوش وجذبۂ عبادت وطاعت پیدا کرنے کے لیے اور ایک مثالی اور آئیڈیل زندگی بنانے کے لیے، بزرگان دین، مجاہدین فی سبیل اللہ، مقبولین عنداللہ، کبار مصنفین ومحققین، مخلصین اور دینی پیشواؤں کی سوانح عمریاں اور حالات زندگی کا مطالعہ بہت ہی مؤثر اور انقلاب انگیز ثابت ہوتا ہے، اس لیے ہر زمانہ میں اس صنف پر کام ہوتا رہا اور مستقل ضخیم کتابیں لکھی گئیں۔

لیکن اس زمانہ میں جب کہ مطالعہ وشوق کے لیے بہت سے امتحانات پیدا ہوگئے اور بعض ضروری وغیر ضروری مصروفیات اور کتابوں کی ضخامت کی وجہ سے سیر وسوانح ہی نہیں بلکہ بعض مرتبہ بہت سی علمی اور ضروری کتابوں سے بھی پہلو تہی برتی جانے لگی، اس کمی کو دور کرنے کے لیے اور نئی نسل میں دینی رجحان، نیا جذبہ وشوق، اپنے ماضی واسلاف کے حالات وواقعات سے واقفیت اور زندگی میں اسلامی اسپرٹ پیدا کرنے کے لیے حضرت مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ استاذ حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو نے ایسے باکمال محققین علماء وفضلا، مخلصین ومقبولین وباخدا بزرگوں کے مختصر حالات اور مؤثر واقعات واصلاحی کارناموں کو مختصر کتابچوں اور پمفلٹ کی شکل میں تیار کرانے کا سلسلہ شروع کیا تھا۔

زیر نظر رسالہ ''تذکرہ حضرت علامہ سید سلیمان ندوی'' اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے،

مختصر ہونے کی وجہ سے اس کا خریدنا، پڑھنا، یاد رکھنا اور اس سے سبق حاصل کرنا بھی آسان ہے، اس رسالہ کی تیاری میں خاص طور سے ''تذکرہ سلیمانی'' از غلام محمد صاحب ''حیات سلیمانی'' از مولانا شاہ معین الدین ندوی صاحب سے استفادہ کیا گیا۔

یہ دراصل مؤلف کا وہ مقالہ ہے جو اس نے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں بزم سلیمانی کے جلسہ میں ۲۰/۴/۱۴۱۷ھ مطابق ۵/۹/۱۹۹۶ء بروز جمعرات بعد نماز عشاء پڑھا تھا، بعد میں یہ راقم کی کتاب ''چند مایہ ناز اسلاف قدیم وجدید'' میں بھی شائع ہوا، اس رسالے کی الگ سے اشاعت کا پروگرام تو بہت پہلے سے تھا، مگر اللہ کے یہاں ہر چیز کا ایک وقت متعین ہے، اس لئے اب اس کی نوبت آئی، ابھی دسمبر ۲۰۱۲ء میں علامہ سید سلیمان ندوی کے صاحبزادے جناب ڈاکٹر سید سلیمان ندوی صاحب جنوبی افریقہ سے لکھنؤ آئے ہوئے تھے، راقم نے یہ مسودہ ان کی خدمت میں پیش کیا اور ان سے اس پر مقدمہ لکھنے کی درخواست کی، یہ درخواست اگرچہ راقم غالباً جون ۲۰۰۵ء میں ان سے جنوبی افریقہ کے سفر کے دوران شہر دربن میں کر چکا تھا، اس لئے اس پر ڈاکٹر صاحب نے ایک وقیع پیش لفظ تحریر فرمایا، اللہ تعالی ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

عزیز القدر مولوی زاہد حسن ندوی سلمہ نے اس کی نقل وتبیض کا فریضہ انجام دیا تھا، اب مولوی حمید اللہ قاسمی نے اس کو کمپوز کر دیا، اللہ تعالی ان دونوں کو اپنی شایان شان اجر عظیم عطا فرمائے۔ آمین

والسلام

یکم ربیع الثانی ۱۴۳۴ھ
مطابق ۱۲/فروری ۲۰۱۳ء

محمد مسعود عزیزی ندوی
رئیس مرکز احیاء الفکر الاسلامی، مظفر آباد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تذکرہ حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ

تمہید

حضرت علامہ سید سلیمان ندوی ایک علمی، تحقیقی، تاریخی، تحریکی اور روحانی شخصیت تھی، اہل علم حضرات میں کون ہے؟ جو ان کی شخصیت سے واقف نہ ہو، حقیقت یہ ہے کہ بیسویں صدی میں ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی کے ذہن وفکر اور یہاں کے تعلیم یافتہ طبقہ میں خواہ وہ طرز قدیم کا ہو یا طرز جدید کا، نصف صدی کے اندر مذاق تصنیف وتالیف، طریق فکر واستدلال اور تہذیبی امیال وعواطف کے اعتبار سے جو عظیم الشان انقلاب ہوا ہے، مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت اور ان کے علمی وعملی کارناموں کو اس میں بڑا دخل ہے، اور یہ انقلاب جس طرح پیدا ہوا، اور اس نے ذہنی وفکری دنیا میں قدیم تعلیم یافتہ طبقہ کو جو سیادت بخشی ہے، اس کی نظیر آج پورے عالم اسلام میں کہیں نظر نہیں آئیگی، علامہ سے متعلق یہ حقائق مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی نے ہندوستانی مسلمانوں پر سید صاحب کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے بیان کئے ہیں، آئندہ سطور میں علامہ کی شخصیت، ان کے علمی کارناموں اور زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے، تاکہ قاری کو اپنی زندگی میں انقلاب برپا کرنے اور سب کچھ ہوکر ساری قابلیتوں اور صلاحیتوں کے باوجود، بلندیوں اور رفعتوں تک پہنچنے کے لیے

اپنے آپ کو مٹانے کا جذبہ پیدا ہو، سچائی اور حق کی تلاش ہو اور

قال را بگذار مرد حال شو ❁ پیش مرد کامل پامال شو

کا جذبہ کارفرما ہو، پھر

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم ❁ تا غلام شمس تبریزی نہ شود

کی عملی تصویر پیش کرکے اپنی زندگی میں جلا بخشے؛ کیونکہ علامہ نے اسی شعر کے مطابق مرشد تھانوی کی غلامی اختیار کی۔

اسم مبارک اور وطن ولادت

حضرت علامہ سید سلیمان ندوی کی ولادت جمعہ کے مبارک دن ۲۳ر صفر ۱۳۰۲ء مطابق ۲۲ر نومبر ۱۸۸۴ء کی صبح کو حکیم سید ابوالحسن دیسنوی کے گھر پر ایک پیکر جمال کی شکل میں ہوئی، دیدہ ور جدامجد حکیم محمدی رحمۃ اللہ علیہ کی نظریں نوزائیدہ پوتے پر پڑیں تو پیشانی کی چمک میں ناپیدا مستقبل کی رفعتیں دیکھ گئیں، نام انیس الحسن اور کنیت ابونجیب رکھی اور فرط خوشی میں یہ قطعہ موزوں فرمایا:

سعید حسن ہست فرزند من ❁ شدہ بوالحسن نام نیکو خصال
خدائش عطا کرد نور بصر ❁ کہ یعنی پسر شد بہ حسن وجمال
بشہر صفر چوں شدہ بود سنہ ❁ جواں بخت آمد چو ماہ ہلال
بروز آدینہ بوقت سعید ❁ بیامد مثال گل نونہال
زآزار وآشوب چشم بدش ❁ نگہدارش آں ایزد لایزال
بدولت قوی باد وعمرش دراز ❁ کند شادمانی بہ ہر ماہ وسال

بہ اقبال ودولت کند سروری　　سر دشمنانش شود پائمال
نہادیم نامش انیس الحسن　　بود حافظش حضرت ذوالجلال
چو جستیم تاریخ اواز خرد　　یکا یک سروشے زتاریخ وسال
بگفتا کہ بے دادشد مصرعہ　　شدہ مہرتاباں ۱۳۰۲ زبرج کمال

غالباً ڈھائی سو برس کی بات ہے کہ حضرت علامہ کے اجداد جزیرۃ العرب سے نکل کر سندھ کے ساحل پر آپہونچے اور یہاں سے اجمیر شریف کے راستے صوبہ متحدہ (یوپی) سے گزر کر بہار کو اپنا مسکن بنایا، چنانچہ عظیم آباد (پٹنہ) کے نواح میں آج بھی سادات کی بارہ بستیاں جو عام زبان میں بارہ گاواں کہلاتی ہیں موجود ہیں۔

حضرت علامہ کا وطن دیسنہ بہار شریف (پٹنہ) سے شمال مشرق آٹھ میل کے فاصلے پر واقع ہے اور سادات بہار کی برادری میں بہت ممتاز ہے۔

سلیمان کی وجہ تسمیہ

رکھنے کو تو روشن ضمیر دادا نے اپنے پوتے کا نام انیس الحسن رکھا، بعد میں دنیا نے بھی دیکھا کہ حسنی صلح جوئی اس کا نمایاں خلق تھا، اسی طرح نسبی شرافت کے اعتبار سے ابونجیب کنیت بھی ہر طرح ہی موزوں تھی، مگر چشم قدرت کچھ اور دیکھ رہی تھی اور اس کے تقاضے کچھ اور ہی تھے، وہ ایک ایسا نام چاہتی تھی جو نومولود کے آئندہ اوج وکمال کا ترجمان ہو، چنانچہ ایک ادنی بہانے سے قدرت کا چاہا پورا ہو گیا۔

ہوا یہ کہ عین اسی زمانے میں ایک رنگونی تاجر سلیمان ناخدا (جس نے کلکتہ کی مشہور مسجد ناخدا تعمیر کروائی تھی) کا ایک جہاز بیرونی سامان تجارت سے لدا ہوا خلیج

بنگال میں داخل ہوا، اس کی آمد سے مشرقی ہندوستان میں ایک دھوم مچ گئی، گھر گھر ہر ایک کی زبان پر سلیمان کا نام آنے لگا، حکیم محمدی رحمۃ اللہ علیہ کے گھر میں بھی چرچا ہوا، گھر والوں نے محبت سے ابونجیب کو پکارا کہ ہمارا سلیمان تو یہ ہے اور ایک دن اس کا شہرہ بھی گھر گھر ہو جائے گا، یہ دراصل اتفاق نہیں؛ بلکہ ایک القائی چیز تھی، غیر شعوری طور پر انیس الحسن اور ابونجیب کے الفاظ ذہنوں سے محو ہو گئے اور جو نام اللہ تبارک وتعالی کو پسند تھا وہی باقی رہا، مقبول ہوا، شہرت پا گیا، پھر جب سلیمان شعور کو پہنچے تو انھوں نے بھی اپنا نام سید سلیمان لکھا، پھر اہل دنیا نے دیکھا کہ وہ سلیمان علم وعرفاں تھے اور ان کے خزینۂ علمی وعرفانی سے ملت اسلامیہ مالا مال ہو گئی۔

لفظ ندوی جزو نام کیوں بنا؟

سید سلیمان ایک پورا نام تھا، ہر سابقہ اور لاحقہ سے بے نیاز، اور یوں بھی حضرت علامہ ندوی کے ذوق لطیف پر زوائد بہت گراں تھے، مگر جو چیز غیب سے بن آئے اور مقدر ہو جائے، اس کو نہ تو کوئی روک سکتا ہے نہ اس میں کوئی ناگواری باقی رہ جاتی ہے؛ کیونکہ وہ ایک طرح کی شان مقبولیت لیے ہوئے آتی ہے۔

مشیت الہی کو یونہی منظور ہوا کہ ۱۸۵۷ء سے ۱۸۸۶ء کے درمیان پانچ سلیمان پیدا ہوئے اور ان پانچوں کو عزت وعظمت کے لیے چن لیا گیا، عمر کے تفاوت کے باوجود ایک ہی وقت میں سب کی شہرت عام ہو گئی، کوئی پختگی عمر کو پہنچ کر نمایاں ہوا، تو کوئی نوعمری ہی میں چمک اٹھا، غرض: ع

آسمان شہرت پر آئے تو کہکشاں بن کر

مشہور عالم، واعظ اور صوفی شاہ سلیمان پھلواروی کو اولیت اور سید سلیمان دیسنوی

کو خاتمیت کا شرف ملا، درمیان میں قاضی سلیمان منصور پوری مصنف ''رحمۃ للعالمین'' مولانا سلیمان اشرف بہاری (سابق صدر شعبۂ دینیات علی گڈھ یونیورسٹی) اور سر شاہ سلیمان (وائس چانسلر علی گڈھ یونیورسٹی) آئے، اس اجتماع کی وجہ سے تخصیص اسمی کی غایت یعنی امتیاز وتعارف فوت ہوگئی تھی، ایک کا اسم گرامی سن کر دوسرے کی شخصیت کا ذہن میں آجانا بعید نہ تھا، حضرت والا نے اس ضرورت کے تحت اپنے نام کے ساتھ دیسنوی کے لفظ کا اضافہ فرمایا، لیکن یہ نسبت خاکی زیادہ نہ چل سکی، اللہ تعالی نے اس کو بہت جلد ہی علمی نسبت سے بدل دیا اور آپ دیسنوی کے بجائے ندوی لکھنے لگے، یہ نسبت معلوم ہوتا ہے کہ قضا وقدرت کی مجوزہ تھی، اس قدر مقبول ہوئی اور نام سے کچھ ایسا میل کھا گئی کہ خود نام ہی کا جزو بن گئی، اب نام سید سلیمان نہیں رہا؛ بلکہ سید سلیمان ندوی ہوگیا، پھر تو ایسا ہوگیا کہ علامہ ندوی یا مولانا ندوی کے الفاظ کے ساتھ ہر ذہن میں حضرت علامہ سید سلیمان ندوی کی تصویر اسی طرح بلا تکلف کھینچ آتی، جیسے مولانا روم کہتے ہی جلال الدین رومی قدس سرہ کا خیال آتا ہے، یا امام غزالی کی صدا پر امام محمد غزالی کا تصور قائم ہوجاتا ہے اور حکیم الامت بولتے ہی حضرت تھانوی کی طرف ذہن منتقل ہوجاتا ہے۔

سچ یہ ہے کہ ندوی حقیقت میں وہی کہلانے کے مستحق تھے، انہی کی ذات اقدس تحریک ندوۃ العلماء کی ترجمان تھی، انہوں نے اپنی علمی جامعیت اور اخلاقی فضیلت سے علماء قدیم اور جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کو ایک دوسرے سے قریب تر کردیا، ایک کو افادے کے ڈھنگ سکھائے، دوسرے کو ضرورت استفادہ کا احساس دلایا، ان کا احسان ملت کے ہر فرد پر یکساں ہے اور وہ بلاشبہ سید الملت ہیں، خود ان کے معاصر

شہید حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی نے بھی اعلانیہ اعتراف فرمایا کہ ''آپ علماء اور تعلیم یافتوں کے درمیاں ایک سفیر ومتوسط کی حیثیت رکھتے ہیں''۔(۱)

علامہ سید سلیمان ندوی کے بعد ان کے شاگرد رشید اور جانشین مفکر اسلام حضرت مولانا علامہ سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ حقیقی ندوی تھے، جو عالم اسلام کے مشہور عالم، مفکر، مدبر، دانشور، مصنف، مؤرخ، ادیب، داعی، صوفی اور ولی کامل؛ بلکہ برکۃ العصر، مجدد زمانہ، امام یگانہ، موفق من اللہ اور آیۃ من آیات اللہ تھے، اللہ تعالی نے ان کو شہرت ومقام اور عزت کی جس بلندی پر فائز فرمایا تھا وہ تاریخ انسانی میں کم ہی لوگوں کا حصہ بنتی ہے، قریبی زمانہ میں اور اس وقت علامہ ندوی یا مولانا ندوی کا نام آتے ہی فوراً ذہن مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی طرف منتقل ہوجاتا ہے۔

تعلیم وتربیت

مولانا حبیبؒ سے ابتدائی تعلیم اور بنیادی تربیت پائی، اور ۱۸۹۹ء میں پھلواری شریف خانقاہ مجیبی میں ایک سال رہ کر مولانا محی الدین سے کچھ کتابوں کی تکمیل فرمائی، پھلواری شریف کے بعد آپ مدرسہ امدادیہ دربھنگہ بھیجے گئے، وہاں ایک سال رہ کر درس نظامی کی بعض اور کتابیں ختم فرمائیں، اس وقت آپ کی عمر سترہ سال تھی، پھر ۱۹۰۱ء میں حضرت مولانا ذہن وفکر کی آخری تربیت گاہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخل کرائے گئے، جہاں آپ نے پانچ سال رہ کر ۱۹۰۶ء

(۱) یادرفتگاں صفحہ ۴۴۵

میں سند فراغ حاصل کی۔

ندوہ پہنچ کر حضرت علامہ کو علامہ شبلی جیسے بے مثل ادیب ومؤرخ، فلسفی ومتکلم، محقق ومفکر کی آغوش تربیت میسر آئی، جس میں خداداد صلاحیتیں خوب نشوونما پا گئیں؛ لیکن جس جامعیت علمی کے وہ حامل تھے، اس میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو کے اساتذہ کا بھی ناقابل نظرانداز حصہ ہے، مثلاً حضرت نے پورے تین سال تک امام معقولات مولانا محمد فاروق چریا کوٹی سے منطق، فلسفہ اور عربی ادب کی تحصیل فرمائی، جو خود مولانا شبلی کے بھی استاذ تھے، علم حدیث اور ہیئت کی تکمیل مولانا حفیظ اللہ مدرس اول دارالعلوم ندوہ سے فرمائی، جو مولانا عبدالحئ فرنگی محلی کے خاص شاگردوں کی آخری یادگار تھے، اسی طرح علم فقہ میں دست رس فقیہ کامل مولانا مفتی عبداللطیف کے زیر تربیت بہم پہونچائی، البتہ کلام، تاریخ اور اردو ادب میں تمام تر علامہ شبلی سے مستفیض رہے، اور اس سے بڑھ کر یہ کہ تحقیق وتدقیق اور تصنیف وتالیف کا اعلی مذاق یہیں سے پایا، ان بلند پایہ اساتذہ کی توجہات کے علاوہ مہتمم مدرسہ شاہ سلیمان پھلواروی کی حوصلہ افزائیاں بھی حضرت علامہ کی علمی ترقی میں معاون رہیں۔

عطائے سند اور آغاز شہرت

وہ ساعت جس میں حضرت علامہ فراغت کی سند پا رہے تھے، قدرت ان کے سر پر شہرت وعظمت کا تاج رکھ رہی تھی، مستقبل کے سلیمانی شکوہ کی طرف چشم قدرت کا اشارہ تھا، حضرت علامہ نے ''حیات شبلی'' میں عطائے سند کے واقعہ کو اس طرح تحریر کیا ہے۔

''دارالعلوم ندوۃ العلماء کو کھلے ہوئے نو دس برس گزر چکے تھے، مگر ابھی تک اس کے فارغ التحصیل طلبہ کی دستار بندی کا کوئی جلسہ جس کا رواج ہندوستان کے عام مدرسوں میں ہے نہیں ہوا تھا، اس غرض سے مارچ ۱۹۰۷ء مطابق محرم ۱۳۲۴ھ میں رفاہ عام لکھنو کے وسیع ہال میں جلسہ دستار بندی کے نام سے ندوہ کا عام سالانہ جلسہ ہوا، جس کی صدارت مولانا غلام محمد صاحب فاضل ہوشیار پوری مرحوم نے کی، جو شروع سے ندوہ کے شریک ومعاون رہے تھے، اس جلسہ کی خصوصیت یہ تھی، کہ اس میں جدید وقدیم علوم کے ماہرین اور اساتذہ کی نہایت اچھی تعداد شریک تھی جو دارالعلوم کے بلند بانگ دعوؤں کا امتحان کرنا چاہتی تھی۔

مولانا شبلی نے اس جلسہ میں پیش کرنے کی غرض سے اپنے چند منتہی طالب علموں کو بعض عنوانات پر تقریر کے لیے تیاری کی ہدایت فرمائی، اس ضمن میں محبی مولوی ضیاء الحسن صاحب علوی (ایم اے رجسٹرار انسپکٹر مدارس عربیہ الہ آباد) نے قرآن مجید کے اعجاز وبلاغت پر اور راقم نے علوم جدیدہ وقدیمہ کے موازنہ پر تقریر کی، اسی تقریر کے دوران ایک واقعہ پیش آیا، جس نے جلسہ کو تماشا گاہ اور سامعین کو آئینہ حیرت بنا دیا، عین راقم کی تقریر کے اثناء کسی نے اٹھ کر کہا کہ اگر یہ عربی میں تقریر کریں، تو بلاشبہ ندوہ کی تعلیمی کرامات کا ہم یقین کریں، مولانا حسب قاعدہ جلسہ سے باہر چلے گئے تھے، مولوی سید عبدالحئ صاحب مرحوم نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ ''تم کر سکتے ہو؟'' میں نے اثبات میں جواب دیا اور عربی میں تقریر شروع کی، جلسہ پر ایک سماں چھا گیا، مولانا کو باہر یہ خبر معلوم ہوئی تو فوراً اندر آئے اور میرے پاس کھڑے ہو کر مجھ سے دریافت فرمایا کہ اگر تم کو اسی وقت کوئی موضوع دیا جائے تو تم

تقریر کر سکتے ہو؟ میں نے پھر اثبات میں جواب دیا، تو مولانا نے مجمع کو خطاب کر کے فرمایا کہ اس طالب علم نے جو تقریر کی، اس کی نسبت بعض لوگ بدگمانی کر سکتے ہیں کہ یہ گھر سے تیار ہو کر آئے تھے، اس رفع بدگمانی کے لیے اگر کوئی صاحب چاہیں تو اسی وقت کوئی موضوع دے سکتے ہیں، یہ اس پر تقریر کریں گے۔

چنانچہ موضوع کے تقرر کے لیے لوگوں نے خواجہ غلام الثقلین مرحوم کا نام پیش کیا، جو اس زمانہ میں لکھنؤ میں وکالت کرتے تھے اور جلسہ میں موجود تھے، انہوں نے یہ موضوع مقرر کیا کہ ''ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کیونکر ہوئی؟'' میں نے اس موضوع پر عربی میں اپنے خیالات ظاہر کرنے شروع کئے، ہر طرف سے احسنت وآفریں کی صدائیں بار بار بلند ہو رہی تھیں، استاذ مرحوم (علامہ شبلی) نے جوش مسرت میں اپنے سر سے عمامہ اتار کر میرے سر پر باندھ دیا، جو اس خاکسار کے واسطے ہمیشہ کے لیے طرۂ افتخار بن گیا۔(۱)

علمی کاموں کا آغاز

آپ زمانۂ طالب علمی ہی میں اپنے وقت کے مشہور علمی رسالہ ''الندوہ'' (۱۹۰۴-۱۹۱۲ء) کے نائب مدیر اور مدیر رہے، جو ایک بڑا اعزاز تھا، اس میں آپ کے بلند پایہ علمی وتحقیقی مضامین شائع ہوئے، اور آپ کے علم وقلم کی شہرت کا آغاز ہوا، آپ نے الندوہ (دور اول) میں ''اشتراکیت اور اسلام'' ''علم ہیئت اور مسلمان'' ''اسلامی رصد خانے'' ''مسئلہ ارتقاء'' جیسے اہم موضوعات پر اعتماد کے ساتھ قلم اٹھایا

(۱) حیات شبلی ۴۵۴/

اور علامہ شبلی کے تلمذ کا حق ادا کر دیا۔

سید صاحب کی صلاحیت اور علمی جامعیت سے علامہ شبلی بہت متأثر تھے اور ہر علمی کام میں انھیں آگے رکھتے تھے، انگریزی تاریخوں کی اغلاط کی نشاندہی کے لیے انہوں نے سید صاحب ہی کو تجویز کیا، چونکہ آپ ایک ممتاز معلم تھے، اس لیے ۱۹۰۸ء میں علامہ شبلی نے آپ کو جب آپ کی عمر صرف ۲۴/ یا ۲۵/ برس کے قریب تھی، دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں علم کلام اور جدید عربی کے ایک اعلی استاذ کی حیثیت سے مسند درس پر فائز فرمایا، اور ان کا یہ انتخاب ایسا لاجواب ثابت ہوا کہ آناً فاناً حضرت علامہ کی تدریسی مہارت کا شہرہ ہندوستان کے طول وعرض میں پھیل گیا اور تشنگان علم دور دور سے اس تازہ چشمہ کی طرف لپکے اور جنھوں نے اس مشرب سے پیا، سیراب ہو گئے، یہ سلسلہ تدریس کا دور اول تھا، جو مختصر ہی رہا، اسی طرح مولانا شبلی اور ندوۃ العلماء کی ایک تجویز کے مطابق ۱۹۱۰ء میں سید صاحب نے عربی کے نئے اور دخیل الفاظ پر مشتمل لغت ''لغات جدیدہ'' کے نام سے بڑی محنت سے تیار کی، جو ندوۃ العلماء کے اجلاس دہلی ۱۹۱۲ء میں پیش کی گئی، اور اہل نظر کی تحسین کی مستحق ٹھہری۔

اس دور میں انھوں نے مولانا عبداللہ عمادی کے مجلّہ ''البیان'' لکھنؤ وغیرہ میں بڑے پختہ اسلوب میں عربی میں بھی بعض مضامین سپرد قلم کئے۔

مولانا شبلی ہی کے ایماء اور مولانا ابوالکلام آزاد کی فرمائش پر آپ نے الہلال (کلکتہ) کی ادارتی ذمہ داری قبول کی اور اپنے علمی وتاریخی مقالات کے ذریعے اس کے وزن ووقار اور شہرت میں اضافہ کیا، ان کے دیرینہ دوست مولانا عبدالماجد

دریابادی اپنے مضمون ''سید سلیمان ایڈیٹر کی حیثیت سے'' میں لکھتے ہیں:

''سید صاحب جب الہلال میں پہنچے تو نام کا یہ اب بھی ہلال ہی رہا، لیکن اہل بصیرت دیکھ رہے تھے کہ ہلال بدر بن گیا ہے اور اس کی نور افشانی کلکتہ کے مطلع سے شروع ہوکر مشرق ومغرب، شمال وجنوب سب کو مطلع انوار بنا رہی ہے۔(۱)

سید صاحب نے ''الہلال'' میں الحریت فی الاسلام، تذکار نزول قرآن، قصص بنی اسرائیل اور مشہد اکبر جیسے مشہور اور معرکہ آراء مضامین لکھے، جنھیں ناواقف لوگ مولانا آزاد کی طرف منسوب کرتے رہے، ۱۹۱۳ء کے اواخر میں ممبئی یونیورسٹی کے نامی گرامی دکن کالج پونا کے اسسٹنٹ پروفیسر ہوئے، اس دکن کالج کے قیام کے دوران آپ نے اپنی مجتہدانہ تصنیف '' ارض القرآن'' کا آغاز کیا، جو قرآنی لٹریچر میں اپنی نوعیت کی پہلی تصنیف ہے اور جس کی وجہ سے متداول تفاسیر کی کتنی ہی تاریخی وجغرافیائی غلطیوں کا ازالہ ہوا، علماء عصر نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور علمی دنیا نے اس احسان سلیمانی کا برملا اعتراف کیا، نیز آپ ایک مایہ ناز ریسرچ اسکالر بھی تھے، آپ کو استاذ محترم علامہ شبلی نے اپنی جانشینی کا تاج عطا فرمایا اور'' سید الطائفہ'' کے لقب سے نوازا۔

مختلف علمی وتعلیمی کام

سید صاحبؒ کی پوری زندگی علمی وتعلیمی مشاغل کے لیے وقف تھی، اور انھوں نے ایک مصروف ترین اور بھرپور علمی زندگی گزاری، اور بلا لحاظ مسلک ومشرب اکثر ملی

(۱) صدق جدید ۲۲ر جنوری ۱۹۵۴ء

اداروں اور تحریکوں کو ان سے فیض پہنچا، وہ علم وفضل کا وہ شجر سایہ دار تھے، جس کے تلے جویائے علم وتحقیق پناہ لیتے تھے، اور علم وادب کی اس جوئے رواں سے سیراب ہوتے تھے، ایک مخلص معلم اور ناصح مشفق کی طرح وہ عمر بھر ملت اسلامیہ کی علمی ودینی، سیاسی ومعاشرتی زندگی کے ہر نازک موڑ پر اس کی رہنمائی اور پیشوائی کرتے رہے اور "الدین النصیحة للّٰه ولرسوله وللمومنین"(۱) پر عمل پیرا رہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ (دہلی) مسلم یونیورسٹی (علی گڈھ) مدرسہ شمس الہدی (پٹنہ) اور محکمۂ تعلیمات (یوپی) کے نصاب ونظام تعلیم کی تیاری اور اصلاح میں آپ نے خاطر خواہ حصہ لیا، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، جمعیۃ علماء ہند، انجمن حمایت اسلام لاہور اور دوسرے اداروں کے جلسوں میں برابر شریک ہوتے رہے اور انھیں اپنے مفید مشوروں سے نوازتے رہے۔

۲۱ر نومبر ۱۹۱۴ء کو دارالمصنفین کے ابتدائی ارکان کا انتخاب ہوا، سید سلیمان ندوی اس کے ناظم منتخب ہوئے، دارالمصنفین برصغیر ہند میں اپنی نوعیت کا مثالی ومنفرد علمی ادارہ ہے، جس کی تاریخی وعلمی خدمات تاریخ ساز اور عہد آفریں حیثیت کی حامل ہیں اور جس کی دیرینہ علمی روایات ہندوستانی مسلمانوں ہی کے لیے نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کے لیے بھی باعث فخر ہے۔

۱۹۱۹ء میں جب تحریک خلافت کی بنیاد پڑی تو اس کے اولین کارگذاروں اور سرگرم حامیوں میں علامہ سید سلیمان ندوی بھی تھے، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی جوہر کی تحریروں کے ساتھ سید صاحب کے علمی وتاریخی رسالوں ''دنیائے اسلام

(۱) صحیح بخاری کتاب الایمان وصحیح مسلم کتاب الایمان حدیث ۸۲

اور مسئلہ خلافت'' اور ''خلافت عثمانیہ اور دنیائے اسلام'' نے اس تحریک کو بڑی تقویت پہنچائی اور اس کے لیے قیمتی مواد فراہم کیا ،فروری ۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی جوہر اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی وغیرہ کے اصرار پر وفد خلافت میں علماء ہند کے تنہا نمائندے کی حیثیت سے یورپ تشریف لے گئے اور نمائندگی کا حق ادا فرمایا۔(۱)

اسی کے ساتھ آپ نے ۱۹۲۳ء میں صوبہ بہار اور ۱۹۲۶ء میں دہلی خلافت کانفرنس کی صدارت فرمائی، سید صاحب جمعیۃ علماء ہند کے بانی ممبران میں تھے، اور اس کے جلسوں میں دلچسپی کے ساتھ حصہ لیتے تھے، مارچ ۱۹۲۶ء میں اس کے اجلاس کلکتہ کی صدارت فرمائی، ۱۹۲۴ء میں جب شریف حسین کو شکست دے کر سلطان عبدالعزیز آل سعود نے حجاز پر قبضہ کرلیا اور بعض مقابر و مآثر کا انہدام کیا تو ہندوستانی مسلمانوں میں بڑا اضطراب واختلاف ہوگیا، اس سلسلہ میں صورت حال معلوم کرنے اور صحیح مشورہ دینے کی غرض سے سید سلیمان ندوی کی قیادت میں ایک وفد حجاز روانہ ہوا، پھر ۱۹۲۶ء میں سلطان عبدالعزیز کی دعوت پر خلافت کمیٹی نے دوبارہ وفد بھیجا جس کی قیادت علامہ ندوی نے کی ، اس وفد نے بڑی جرأت اور صاف گوئی سے کلمہ حق کہا اور مسلمانان ہند کی آواز مکے اور مدینہ تک پہنچادی۔

اکتوبر ۱۹۳۳ء میں شاہ افغانستان نادر خان شہید نے افغانستان کے نظام تعلیم کی ترتیب وتنظیم کے لیے ہندوستان سے ایک علمی وفد کو دعوت دی، جس میں علامہ اقبال اور سر سید راس مسعود کے ساتھ علامہ سید سلیمان ندوی بھی تھے، سید صاحب نے افغانی نصاب ونظام تعلیم کی تیاری میں سرگرم حصہ لیا اور مفید مشورے دیئے۔

(۱) تذکرہ سلیمانی ۵۹

علامہ ندوی اپنے نامور استاذ علامہ شبلی سے گہرے تأثر اور عقیدت کی بنا پر عمر بھر تحریک ندوۃ العلماء کے بھی پرجوش داعی ومبلغ اور وکیل وترجمان رہے، اصلاح وترقیٔ نصاب ان کا دائمی نصب العین رہا اور وہ ایک ماہر تعلیم کی صورت میں مدارس وجامعات کے اصلاح نصاب کے ساتھ ندوۃ العلماء کے نصاب ونظام تعلیم کی تعمیر وتشکیل میں بھی برابر حصہ لیتے رہے، اور طلبہ واساتذہ کی رہنمائی کرتے رہتے تھے، ان کی اس دلچسپی اور اس تعلیمی تحریک سے ہمدردی کی بنا پر ۱۹۲۳ء میں سید صاحب کو ندوۃ العلماء کا معتمد تعلیم منتخب کیا گیا اور تقریباً تیس سال (۱۹۲۳ء سے ۱۹۵۳ء تک) سید صاحب دارالعلوم ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم رہے۔

حضرت علامہ نے مستشرقین اور بعض متعصب ہندوستانی مورخین کی غلط بیانیوں کی مدلل تنقید وتردید کی اور تاریخ ہند وتاریخ اسلام کے بارے میں بعض مشہور غلط فہمیوں کا بڑے فاضلانہ ومورخانہ انداز میں ازالہ کیا ، نیاز فتح پوری کے ہفوات اور شکوک وشبہات کا اس علمیت اور دینی حمیت کے ساتھ دفاع کیا کہ انھیں توبہ نامہ شائع کرنا پڑا۔

آزاد ہندوستان میں اسلامی نظام تعلیم کے غیر یقینی مستقبل کی طرف سے اپنی فکر مندی ظاہر کرتے ہوئے سید صاحب نے دینی ودنیوی علوم پر مشتمل جامع نصاب کی اہمیت پر بہت زور دیا اور مختلف مدارس اسلامیہ کے جلسوں میں انھوں نے نئے حالات میں علماء وطلباء کو اجتماعی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی دعوت دی اور عملی طور پر مدارس اور عصری دانشگاہوں کے دینی نصاب تعلیم کی تشکیل میں نمایاں حصہ لیا، جس کی وجہ سے بہت سے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اسلامی تعلیمات کا چراغ جلتا

رہا اور نوجوانوں کو رہنمائی اور روشنی ملتی رہی۔

۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۰ء تک بھوپال میں آپ تعلیمی اور قانونی اداروں کے سربراہ رہے، جس سے اس ریاست کو بڑا سنبھالا ملا، پھر بعض حالات کی بنا پر ۱۹۵۰ء میں آپ نے پاکستان ہجرت کی اور اپنی علمی و تعلیمی و قانونی و سیاسی صلاحیتوں کو اس نوتعمیر مسلم ریاست کی صحیح خطوط پر تشکیل کے لیے وقف کر دیا، اسلامی دستور کی ترتیب اور ''آل پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی'' اور جمعیۃ علمائے اسلام میں آپ کی شرکت بڑی اہمیت کی حامل تھی۔(۱)

غرضیکہ سید صاحب کی زندگی کے دو حصے ہیں: ایک حصہ تو وہ ہے، جو پھلواری شریف، دارالعلوم ندوۃ العلماء، دفتر ''الہلال'' پونہ فرگوسن کالج اور آخر میں دارالمصنفین کے علمی زاویہ میں گزرا۔ اور دوسرا ان کے آئے دن کے مختلف اندرون ملک اور بیرون ملک، یورپ، حجاز، افغانستان کے سفروں میں گزرا، جن کا سلسلہ زندگی کے آخر تک قائم رہا، ان کی زندگی میں یہ تجزیہ کرنا مشکل تھا کہ وہ دارالمصنفین میں زیادہ رہے، یا سفر میں، بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ سال میں چھ مہینہ تو دارالمصنفین میں تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے تھے اور چھ مہینہ سفر میں رہتے تھے۔(۲)

شکوہ سلیمانی

تکمیل تعلیم سے چالیس برس کی عمر تک کا زمانہ حیات سلیمانی کے سرتاپیر علمی شغف، تحقیقی انہماک اور تصنیفی مصروفیت کا دور ہے، گو درمیان میں کبھی کبھی اجتماعی کاموں میں بھی حصہ لینا پڑا، لیکن یہ محض اپنوں کے اصرار اور پاس و مروت سے تھا،

(۱) تاریخ ندوہ جلد دوم ۲۸۳ (۲) سید سلیمان ندوی ۱۱۸

ورنہ مرکز توجہ کبھی بدلنے نہ پایا، چنانچہ جب ۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی کے اصرار پر وفد خلافت کے رکنِ خاص بن کر یورپ روانہ ہو رہے تھے، تو ایک مکتوب میں اپنے عم محترم مولانا عبدالحکیم دیسنوی کو لکھتے ہیں۔

''ڈر ہے کہ کہیں پالیٹکس مرے علمی مشاغل کو تہہ و بالا نہ کر دے'' اس فقرے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت علامہ کو اپنا متعینہ مقصد کس درجہ عزیز تھا اور اس سے کچھ دیر کے لیے دوری بھی نہیں؛ بلکہ کم التفاتی بھی کیسی شاق تھی، یوں معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالی نے اس دور میں جہاد علمی ہی کی خدمت آپ کو عطاء فرمائی تھی، چنانچہ اس معرکہ کے وہ شہسوار نکلے اور اس میدان میں ان کو وہ نصرت اور غلبہ حاصل ہوا جو ہر زمانہ میں کسی کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔

یہ تو دیکھا جا چکا ہے کہ عطائے سند کے ساتھ ہی دفعتاً اہل علم کی بزم نے محسوس کیا کہ ایک علم نواز آ رہا ہے، یہ سلیمان عالی مقام کی آمد آمد کا چرچا تھا، پھر دیکھتے ہی دیکھتے ملک سلیمانی کے حدود اتنے پھیلے اور ایسے پھیلے کہ نئی اور پرانی علمی دنیا سب زیر نگیں آ گئیں۔(۱)

اضطراب روحانی

ظاہری علوم کب کسی مخلص متلاشی حق کا ساتھ دے سکے ہیں، علامہ فہاد جلال الدین رومیؒ برسہا برس میدان علم کی بادیہ پیمائی کرتے رہے، بالآخر ہار مان کر جب شمس تبریز قدس سرہٗ کی رفاقت قبول کی، تب ہی منزل مقصود پر جا پہنچے، امام ہمام

(۱) معارف بابت ۱۹۵۶ء

محمد بن محمد غزالی نے معقول ومنقول کے سمندر کنگھال ڈالے، لیکن درّ مقصود کو نہ پاسکے، سراسیمہ پریشان ہوکر جب بوعلی فارمدی قدس سرہٗ کے آستانہ پر آئے تو یہاں حاصل جستجو کو موجود پایا، مطمئن وسرشار ہوگئے، اس کی وجہ کیا ہے؟

وجہ صرف یہ ہے کہ روح کو تسکین یقین سے ملتی ہے اور یقین کامل کسی حقیقت کے مشاہدہ ہی سے حاصل ہوتا ہے، عقل بیچاری حقائق کا قائل کر بھی دیتی ہے، تو ان کو دکھا نہیں سکتی۔

عقل گو آستاں سے دور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں

اس لیے ہر کامل العقل انسان علم کتابی کے نقطۂ کمال پر پہنچ کر مضطرب ہوجاتا ہے، اور اپنی روحانی تشفی کے لیے وہ ایسے ذرائع ڈھونڈنے لگتا ہے، جو اس کو حضوری بخش سکیں، معلوم کا مشاہدہ کرسکیں، چنانچہ مرحلہ اربعین سے گزر کر یہی اضطراب یگانۂ عصر حضرت علامہ سید سلیمان ندوی کو پیش آیا اور بڑی شدت سے پیش آیا، یہ ان کے اخلاص علمی اور بلند نگاہی کا لازمی نتیجہ ہے، عین اس اوج علمی پر پہنچ کر جو اس دور میں ان کے لیے خاص ہوگئی تھی، حضرت والا کا قلبی اضطراب اور روحانی تشنگی اتنی بڑھ گئی کہ جو بھی جاہ ومنزلت زیر قدم آئی، ہمت عالی نے اس پر قناعت سے انکار کیا، ملک دانش زیر نگیں آیا، تو نظریں مطلع عرفاں کو تاکنے لگیں۔ ع

ملک واقلیم از بگیر و پادشاہ
ہمچناں در بند اقلیم دگر

محبت اور معرفت الٰہی کی جو چنگاری لڑکپن ہی سے دل میں پڑی ہوئی تھی اور

برابر سلگتی جارہی تھی، اب اس نے قلب کو گرما دیا، حاسہ قلبی جاگ اٹھا، ضرورت محسوس ہوئی کسی کے جنبش داماں کی۔

ع آتش افتاد بجاں جنبش داماں مددے

مگر دامن کہاں سے لاتے، کس کا ہاتھ تھامتے، شیخ کی تلاش اور جستجو میں دس سال گزر چکے تھے۔

انتخاب شیخ

مغربی یوپی کے قصبہ تھانہ بھون، ضلع مظفرنگر میں اس وقت حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی صاحب کے خلیفہ ارشد حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ ہی تھے، جن کی ذات بابرکات سے خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون کو وہ مرجعیت حاصل ہوگئی تھی، جو گیارہویں صدی کے آغاز پر حضرت مجدد الف ثانی کی ذات اقدس سے سرہند کو حاصل تھی، چنانچہ حضرت علامہ کے قلب ونظر نے پھر ذات اشرف ہی کی طرف جاذبیت محسوس کی اور ایسی جاذبیت جس نے رجوع اور بیعت پر مجبور کردیا۔(۱)

بیعت وسلوک وطریقت

حضرت علامہ سید سلیمان ندوی جب دس سال شیخ کی تلاش وجستجو میں گزار چکے اور انتخاب شیخ کا فیصلہ کرلیا تو اس کی بار آوری ۱۹۳۸ء میں ہوئی۔

(۱) تذکرہ سلیمانی صفحہ ۱۱۴

جستجو آج وہاں پر مجھے لے آئی ہے
خود جہاں حسن محبت کا تماشائی ہے

اور آپ کو شیخ سے مناسبت تامہ ہوگئی، تو حضرت حکیم الامت سے بیعت کی درخواست پیش کی، حضرت حکیم الامت نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ ''پچاس خط لکھ چکیں تو پھر انشاء اللہ'' پھر فرمایا'' خواہ روزانہ یا صبح وشام خطوط لکھ کر یہ عدد پورا کر دیجئے'' یہ حضرت تھانویؒ نے اپنی انتظامی شان کے پیش نظر بیعت سے قبل ایک معتد بہ مراسلت کی شرط عائد فرمائی، مگر حضرت والا نے یہ شرط قبول فرمائی کہ ع

ہر چہ از دوست میرسد نیکواست

لیکن اس انقیاد نے ان کو یہ شرف بخشا کہ ابھی چند ہی خطوط آئے گئے تھے کہ تھانہ بھون کی ایک حاضری میں حضرت تھانویؒ نے از خود بیعت سے سرفراز فرمادیا، گویا ایک عطاء کو بے طلب اور بے گماں بنا کر اور بھی لذیذ بنادیا، بیعت کے بعد حضرت تھانوی نے ارشاد فرمایا کہ الحمدللہ میرے حصہ میں سارے عقلا ہی آئے ہیں۔(۱)

خلافت سے سرفرازی

اگست ۱۹۳۸ء کو حضرت سید سلیمان نے راہ سلوک میں قدم رکھا اور اب اکتوبر ۱۹۴۲ء آ پہنچا تھا، مسافر نے عشق ومعرفت کی اتنی منزلیں طے کر لی تھیں کہ اب مجدد وقت حضرت تھانوی کی نگاہ میں راستہ کے سارے نشیب وفراز اور پیچ وخم سے پوری طرح باخبر اور ناواقفوں کی رہبری کے لیے ہر طرح لائق اعتبار تھا، حکیم الامت

(۱) تذکرہ سلیمانی صفحہ ۱۲۴/۱۲۵۔

نے اپنے قلبی داعیہ کی مزید تشفی کی خاطر استخارہ فرمایا، استخارہ سے تائید وتقویت پائی، بس اس کے بعد سید والا مرتبت کو سلاسل اربعہ میں خلافت باطنی عطا فرمادی اور مسند ارشاد پر ان کو متمکن فرمادیا، پھر خود اپنی حیات میں بعض اپنے زیر تربیت افراد کو بھی اپنے خلیفہ مجاز حضرت سید صاحب کے سپرد فرمایا، یہ واقعہ ۲۲/اکتوبر ۱۹۴۲ء کا ہے، حضرت حکیم الامت کے خلیفہ مجاز حافظ عثمان روایت کرتے ہیں کہ ''حضرت سید صاحب کو خلافت عطا فرما کر حضرت حکیم الامت اس درجہ مسرور ومطمئن تھے کہ بارہا فرمایا کہ الحمدللہ مجھے اب کچھ فکر نہیں، میرے بعد ایسے ایسے لوگ موجود ہیں''۔

مرشد اور وہ بھی مرشد تھانوی جیسے محقق شیخ کی نگاہ تحقیق میں یہ اعتبار کوئی معمولی امتیاز نہیں ہے۔(۱)

دیوبند اور علی گڈھ کا اعتراف

حضرت والا کے تبحر علمی، ان کی وسعت نظر اور ان کی علمی دیانت وغیر جانبداری نے ان کو دیوبندی مکتب خیال اور علی گڈھ اسکول میں یکساں اعتماد اور عزت عطا فرمائی تھی، چنانچہ ان کی ہمہ گیر شخصیت کے اعتراف میں دارالعلوم دیوبند نے ان کی خدمت میں مجلس شوری کی رکنیت پیش کی اور علی گڈھ یونیورسٹی نے ان کو اپنی سینٹ کا ممبر بنانے میں عزت محسوس کی اور پاکستان جانے تک وہ ان دونوں اداروں کے مشیر ومعاون رہے۔(۲)

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند تحریر فرماتے ہیں کہ

(۱) تذکرہ سلیمانی ۱۴۱۔
(۲) تذکرہ سلیمانی ۵۸

''حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے قابل فخر عالم وفاضل اور شبلی نعمانی مرحوم کے جانشین، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے خلیفہ مجاز تھے، ہندوستان کے دو بڑے تعلیمی ادارے مسلم یونیورسٹی علی گڈھ اور دارالعلوم ندوہ کے اکثر وبیشتر عمائدین حضرت حکیم الامت تھانویؒ اور دوسرے اکابر دیوبند سے مستفیض ہوئے، ان میں علامہ سید سلیمان ندویؒ اور مولانا عبدالباری ندویؒ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، جو حضرت حکیم الامت تھانویؒ سے فیض یاب ہوئے، حضرت مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوری کے بھی باقاعدہ ممبر رہے اور احقر سے خصوصی شفقت ومحبت بھی فرماتے رہے، ان کا علم وفضل اور زہد وتقوی مثالی تھا، انہوں نے زندگی بھر علم کی شمعیں جلائے رکھیں اور ہندو پاک میں ان کی خدمات جلیلہ قابل قدر ہیں، جنھیں فراموش نہیں کیا جاسکتا، شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی کے بعد ان کی ذات گرامی پاکستانی قوم کے لیے سرمایہ افتخار ونازش تھی۔(۱)

حسن اخلاق

حضرت علامہ کے نہ جاننے والے یا صرف دور آخر کے پہنچاننے والے جو کچھ بھی سمجھتے ہوں، مگر جن خوش نصیبوں کو ان کی دیرینہ رفاقت کا فخر حاصل ہے، وہ اس بات کے گواہ ہیں کہ وہ اشرفی نسبت سے پہلے اور بہت پہلے بھی سیرت نگار، رسول اطہر کی حیات، خلق اسلامی کا نہایت پاک وصاف مرقع تھے، فضائل اخلاق کے

(۱) دارالعلوم دیوبند کی پچاس مثالی شخصیات صفحہ ۱۵۴

حصول کے لیے ان کو مجاہدہ وریاضت کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی؛ کیونکہ یہ دولت ان کو بے مانگے اور گھر بیٹھے مل چکی تھی، وہ سید زادہ تھے اور غیرت ومروت، حیا وتواضع، حلم وایثار، فراخ دلی اور بلند نگاہی، ان میں بالطبع موجود تھی، تعصب، تنگ نظری، حرص، جاہ ومال ان کے لیے اجنبی اور مکروہ ترین چیزیں تھیں، حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی کو حضرت والا کی چالیس سالہ رفاقت حاصل رہی ہے، مولانا فرماتے ہیں کہ ''ہمارے سید صاحب تو مولانا تھانوی سے نہ بھی رجوع فرماتے تب بھی وہ نیک ہی تھے، اس لیے کہ رذائل اخلاق بالطبع ان میں موجود ہی نہ تھے''۔

اسی طرح کی تصدیق حضرت علامہ کے ایک اور دیرینہ رفیق مولانا عبدالباری ندوی کی زبانی بھی سنئے، جن کی نظر طالب علمانہ دور سے لے کر حضرت والا کی عارفانہ منزلت تک سیرت سلیمانی کا آزادانہ مشاہدہ کرتی رہی ہے، مولانا تحریر فرماتے ہیں کہ ''سید صاحب بطنی سید ہی نہیں ماشاءاللہ بڑے بطنی سعید تھے، مرحوم معصوم نہ تھے، لیکن ان کی زندگی کا جو رخ طالب علمی سے لے کر آخر تک کم وبیش ہر نوع کے سابقہ میں سب سے زیاد معصوم نظر آیا، وہ یہی خودرائی وخود پسندی دور دور نظر نہیں آتی''۔

یہی خودرائی وہ خود پسندی تو ارباب بصیرت کے نزدیک ام الامراض ہے، جس کے علاج ومعالجہ میں مدتوں کی سعی وکاوش کے بعد بھی شفائے کلی کا یقین خطرناک سمجھا جاتا ہے اور یہاں خلق سلیمانی میں سرے سے اس کا کوئی جرثومہ نہیں ملتا، مگر اس پر حیرت کیوں جب کہ "إن النفس لأمارة بالسوء" کے کلیہ کے تحت "إلا مارحم ربی" کا استثناء خود قرآن کریم میں موجود ہے۔(۱)

(۱) سیرت السید سلیمان نمبر معارف تلخیص از تذکرہ سلیمانی ص ۶۷-۶۸۔

علمی وتاریخی کارنامے

بڑے مصنفین میں بھی بہت کم ایسے مصنف ہوتے ہیں جن کی ہر تصنیف معیاری ہو، مگر سید صاحب اس امتیاز خاص کے مالک تھے، کہ ان کی ہر کتاب علمی اور معیاری ہے، اور کسی نہ کسی اہم موضوع سے تعلق رکھتی ہے، اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی ہر کتاب پر پوری محنت کرتے تھے، اور اسے اپنی آخری کتاب سمجھتے تھے، مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندویؒ لکھتے ہیں:

''سید صاحب میں علمی کام کرنے کا بڑا ولولہ اور اس کی قوت (ENERGY) تھی، وہ ہر تصنیف کو اس طرح مکمل کرنا چاہتے تھے اور اس طرح اس کی طرف متوجہ ہوتے تھے، گویا یہ زندگی کی اصلی اور آخری تصنیف ہے، وہ اس کے سلسلے میں اپنے امکان بھر کوئی کمی نہیں کرتے تھے''۔(۱)

ان کی علمی تحقیق، تنقیدی تحقیق وجستجو کا اعلی نمونہ ہے، ان کی تحقیقات نے بڑے معرکے سر کئے، بڑے انکشافات کئے اور اسلام اور مسلمانوں کی طرف سے دفاع کا حق ادا کر دیا، ان کی ساری ہی کتابیں تحقیق کے اونچے معیار پر پوری اترتی ہیں۔

حضرت علامہ اپنے دور کے اردو زبان کے سب سے بڑے مصنف تھے، انہوں نے مختلف موضوعات پر متعدد ضخیم کتابیں لکھیں اور سارے ملک سے خراج تحسین حاصل کیا، ان میں سیرت النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آخری پانچ جلدیں سید صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ ہے، جو امام غزالی کی ''احیاء العلوم'' جیسی جامع

(۱) پرانے چراغ جلد اول صفحہ ۵۹

کتابوں میں سرفہرست رکھی جانے کی مستحق ہے، یہ اسلامی ادبیات کی ان یادگار اور سدا بہار کتابوں میں ہے جو اپنے مواد و اسلوب، علمی وفکری اہمیت و افادیت، احقاق حق وابطال باطل، اسلام کی صحیح ترجمانی اور دلنشیں تعارف میں اپنی نظیر آپ ہیں، کوئی دوسری کتاب ان کا بدل نہیں، اور جو علمی دنیا میں تاریخ ساز حیثیت رکھتی ہیں، اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا کتاب وسنت کے ذخیروں پر مبنی ہونا ہے، اس سے سید صاحب کی گہری قرآن فہمی کا بھی اندازہ ہوتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کتاب وسنت کے سارے دفاتر آپ کے سامنے کھلے ہوئے ہیں۔

سیرت النبی علامہ شبلی اور دارالمصنفین کا سب سے بڑا کارنامہ ہے، جس کی تکمیل اخیر کی پانچ جلدیں سید صاحب نے لکھ کر کی، مگر اس کی ابتدائی دو جلدوں کی تیاری میں بھی انہوں نے اپنے استاذ مرحوم علامہ شبلی کا ہاتھ بٹایا، سیرت کی اشاعت ہی سے دارالمصنفین کی بنیاد مضبوط ہوئی، جو برصغیر ہند میں اپنی نوعیت کا مثالی ومنفرد وعلمی ادارہ ہے۔

سیرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) کا آغاز زمانۂ طالب علمی میں ہوا تھا، مگر اس میں فقہ وکلام اور ادب وتاریخ سے بڑے عالمانہ انداز میں بحث کی گئی ہے اور ام المومنین کی پاکیزہ سیرت اس شائستہ انداز میں پیش کی گئی ہے، جو مخالفوں کے لیے بھی چشم کشا ہے۔

''ارض القرآن'' سید صاحب کی تحقیق کا سب سے اعلی نمونہ ہے، ان سے پہلے اس موضوع پر اس انداز سے شاید کسی نے قلم نہیں اٹھایا تھا، اقوام عرب کے سیاسی، تاریخی اور تمدنی حالات کی قرآن سے تطبیق، عبرانی وانگریزی مآخذ اور اسلامی، اسرائیلی اور رومی ویونانی ادبیات اور اثری اکتشافات سے استفادہ اس کی اہم

خصوصیت ہے، اس کتاب پر ان کے دوست مہدی افادی نے لکھا تھا کہ ''مجھے حیرت ہے کہ ایک کام جو علم آثار کے ایک زبردست ماہر فن کے کرنے کا تھا، وہ بھی ساٹھ برس کے بعد یورپ کی کسی اکیڈمی میں بیٹھ کر، آپ اس پر کیوں کر قابو حاصل کر سکے۔(۱)

''خیام'' ان کی تحقیق کا دوسرا بڑا قدم ہے جس نے نئے علمی میدان فتح کئے اور خیام کی شخصیت سے پہلی بار اس طرح پردہ اٹھایا کہ مستشرقین نے بھی ان کی بلند پایہ تحقیق کا اعتراف کیا، شاعر مشرق علامہ اقبال نے انھیں لکھا کہ ''عمر خیام پر آپ نے جو کچھ لکھ دیا ہے، اس پر اب کوئی مشرقی یا مغربی عالم اضافہ نہ کر سکے گا، الحمدللہ کہ اس بحث کا خاتمہ آپ کی تصنیف پر ہوا۔(۲)

حیات شبلی بہت مشہور ہے جو نہ صرف مولانا شبلی کی سوانح عمری، بلکہ ۱۹۵۷ء تک صوبہ متحدہ خصوصاً اس کے مشرقی اضلاع کی دوڈھائی صدی کی علمی و تعلیمی تاریخ ہے، یہ کتاب سوانح نویسی و وقائع نگاری کا ایک جامع اور معیاری و مثالی نمونہ ہے، اس میں ایک فرد کے ساتھ کتنی ہی تحریکات اور ثقافتی حالات کا ایک جامع مرقع تیار ہو گیا ہے، اسی کے ساتھ منصفانہ سوانح نگاری کی بھی ایک اچھی مثال ہے۔

حضرت علامہ نے مستقل تصنیفات کے علاوہ جن میں سے ہر ایک ان کے ذوق تحقیق کی آئینہ دار ہے، مختلف موضوعات پر سینکڑوں محققانہ علمی، ادبی، مذہبی و تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں، جو الندوہ، الہلال اور معارف کے ہزاروں اوراق میں پھیلے ہوئے ہیں اور بہت سے مستقل رسالوں کی شکل میں شائع ہو چکے ہیں، مثلاً رسالہ

(۱) نقوش لاہور، شخصیات نمبر ۱۸۲۔

(۲) ماہنامہ ریاض کراچی مارچ ۱۹۵۴

اہل سنت والجماعت، بہادر خواتین اسلام، حیات امام مالک، خلافت اور ہندوستان اور اپنے استاذ علامہ شبلی کے تتبع میں زیادہ تاریخی مضامین لکھے، مثلاً ''مرہٹوں کا فوجی نظام''، ''عہد اسلام میں تعلیم نسواں کی درسگاہیں''، ''لاہور کا ایک فلکی آلات ساز خاندان''، ''عربوں کی بحری تصنیفات''، ''رومن کیتھولک کی چند من گھڑت کہانیاں''، ''برمک اور پرمکھ واقدی''، پھر واقدی، تاج محل اور لال قلعہ کے معمار قنوج وغیرہ۔

اسی طرح آپ کے متعدد خطبات ہیں جو بہت مقبول ہوئے، مثلاً خطبات مدراس جو بہت مشہور ہے، اس میں سیرت کا عطر و خلاصہ، عصری ذہن کو سامنے رکھتے ہوئے آ گیا ہے، وہ عرصے تک سیرت نگاروں اور اسلامیات پر کام کرنے والوں کے لیے روشن چراغ کی اہمیت رکھے گا، اور انہیں بحث و نظر کے لیے رہنما خطوط مہیا کرتا رہے گا۔

سید صاحب کے تحقیقی کارناموں میں ''عربوں کی جہاز رانی''، ''عرب و ہند کے تعلقات'' اور ایک تاریخی خطبہ ''لاہور کا ایک مہندس خاندان جس نے تاج محل اور لال قلعہ بنایا'' اور ''نقوش سلیمانی'' بھی ہیں، جو چشم جستجو کے لیے سرمہ سلیمانی اور بیابان تحقیق کے لیے قندیل رہبانی کی مثال ہیں، یہ کتابیں مسلمان محققین کے لیے خاص طور پر سبق آموز ہیں کہ تحقیق کس بات کی، کس لیے کس طرح ہونی چاہئے، حضرت علامہ نے اپنی زندگی میں دینی، علمی اور تاریخی بے شمار کارنامے انجام دئے ہیں، یہاں مختصر کارناموں پر اجمالی روشنی ڈالدی گئی ہے۔(۱)

سید صاحب ان باتوفیق اہل قلم میں تھے، جو پورے اخلاص کیساتھ ملت وانسانیت کی ذہنی و فکری رہنمائی اور کردار سازی کے لیے وقت کے حقیقی تقاضوں

(۱) علامہ سید سلیمان ندوی، مصنفہ مولانا ابوعلی اثری: ناشر ندوۃ المحدثین گوجرانوالہ پاکستان تلخیص از ۱۱۲ تا ۱۱۹

اورزمانہ کے ضروری مطالبوں کو سامنے رکھ کر قلم اٹھاتے ہیں اوران کی ہر جنبش قلم حق وصداقت کی تائید یا باطل افکار وخیالات کی تردید وتنقید ہی کے لیے ہوتی ہے اوران کے اخلاص کے ترکش سے نکلا ہوا ہر تیر نشانے پر بیٹھتا ہے اوران کی ہر تجویز ذہن وعمل کی دنیا میں انقلاب عظیم پیدا کردیتی ہے۔

سید صاحب کے اصل مخاطب مدارس اسلامیہ اور کالجوں، یونیورسٹیوں کے طلبہ اور فضلاء اور تعلیم یافتہ طبقہ ہے، جو کسی قوم کا ذہن ودماغ اور مغز وجوہر (CREAM) ہوتا ہے اور وہ قومی جسم میں قوت محرکہ کی حیثیت رکھتا ہے، سید صاحب نے ''معارف'' کے شذرات کے ذریعہ ذہن سازی اور تعمیر سیرت کا فرض جس احساس ذمہ داری کے ساتھ ادا کیا وہ ایک عظیم کارنامہ ہے، وہ ہر ماہ، ملت کو کسی نہ کسی اہم پہلو کی طرف متوجہ کرتے، حکمت عملی بتاتے، ترقی کے صحیح دینی اصول سمجھاتے اور متوقع یا پیش آمدہ خطرات وخدشات کی طرف سے آگاہ کرتے رہتے تھے، وہ حضرت عمرو بن العاص کی اس ہدایت کا مکمل نمونہ تھے، جس میں مومن کو ہمہ وقتی جنگی محاذ (رباط دائم) کا سپاہی کہا گیا ہے۔

ان کی اس فکرمندی وبالغ نظری اور احساس فرض اور اس کی انجام دہی کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے گذشتہ صدی کے نصف اول میں ملت کے تعلیم یافتہ طبقہ اور علماء کو خصوصیت سے متاثر کیا اوران کی درمیانی خلیج کو بڑی حد تک پاٹ کر اسلامی معاشرہ میں ذہنی وعملی بیداری پیدا کی اور اسے کھوکھلے سیاسی نعروں کے پیچھے دوڑنے کے بجائے اپنے مقام وموقف اور مقصد کو پہچاننے اور مسلک سلف سے انحراف سے بچنے کا حوصلہ عطا کیا۔(۱)

(۱) تاریخ ندوہ جلد دوم صفحہ ۴۸۷

دور علالت

سید صاحب کی علالت کا آغاز دراصل استسقائے قلبی کے عارضہ سے ہوا، جو ۱۹۴۵ء میں اعظم گڈھ میں لاحق ہوا تھا، ۸/دن تک لیٹنا تو درکنار بیٹھنا بھی محال ہوگیا تھا، رفتہ رفتہ بیٹھنے اور لیٹنے کے قابل ہوسکے، مگر اس مرض نے مستقل اثرات چھوڑے، مثلاً تنفس کی شکایت ہمیشہ کے لیے رہ گئی، بے خوابی کی شکایت بھی تقریباً قائم ہوگئی تھی۔

ان عوارض کا لازمی نتیجہ ضعف اعصاب تھا، ۴۹ء میں سفر حج سے واپسی پر جہاز میں طبیعت گراں ہوگئی اور گھر پہنچ کر صاحب فراش ہوگئے، علاج ومعالجے کے بعد طبیعت سنبھل گئی، اس کے بعد جون ۵۰ء میں کراچی تشریف لے گئے، وہاں کا موسم راس نہ آنے کے باعث صحت پھر گرتی چلی گئی، علاج کے بعد پھر صحت یاب ہوگئے اور اپنے علمی کاموں میں لگ گئے، ۵۲ء کی گرمیوں میں حکومت کے قائم کردہ بنیادی کمیٹی کا اجلاس نٹھوپا گلی میں منعقد ہوا، حضرت کو بھی اس میں شرکت کرنی پڑی، ۸/ ہزار فٹ کی بلندی ان کے لیے ناقابل برداشت ثابت ہوئی، تنفس کا شدید دورہ پڑا خون کا دباؤ بہت بڑھ گیا، غرض مرض کی نوعیت جان لیوا ثابت ہوئی، گو علاج بہت ہوئے لیکن کما حقہ افاقہ نہ ہوسکا۔

رحلت حضرت علامہ

انتظار کی مدت اب تمام ہوتی جارہی ہے اور کسی عارف کے بقول ؎

من زتن عریاں شدم او از خیال
می خرامم در نہا باعث الوصال

کا مرحلہ اب قریب ہے، اتوار ۱۴/ ربیع الاول ۱۳۷۳ھ م ۲۲/ نومبر ۱۹۵۳ء کی

شب بس آنکھوں ہی آنکھوں میں گذری، پچھلی رات کو قلب کا ایک دورا پڑا، تنفس تیز ہو گیا، اہل وعیال پریشان ہو گئے، ڈاکٹروں کو تلاش کیا گیا لیکن رات کا وقت ہونے کی وجہ سے حضرت نے منع فرمایا، بفضلہٖ تعالی افاقہ ہوا اور اپنے اہل خاندان سے جی بھر کے باتیں کیں۔

شام وداع کا منظر

اتوار کا دن اب ختم ہونے کو ہے، مغرب کی نماز بیٹھ کر ادا فرمائی، نماز سے فراغت کے بعد تسبیح طلب فرمائی، تسبیح کی وجہ دریافت کی گئی، فرمایا کہ آج میں شوکت علی مرحوم کی سی نماز پڑھی ہے کہ وہ بھی اسی طرح بیٹھ کر نماز پڑھا کرتے تھے (آخری ایام میں بدن کے بھاری ہونے کی وجہ سے) اس کے بعد حضرت کو آرام کے لیے کہا گیا، آپ نے کہا بہت اچھا، یہ نطق سلیمانی کے آخری کلمات تھے۔ اس کے بعد داھنی کروٹ قبلہ رخ دائیں ہاتھ کو گال کے نیچے دبایا اور پاؤں سکیڑے، حضرت عین مطابق سنت لیٹ گئے اور آنکھیں بند فرمالیں، عینی مشاہدوں کے بقول سونے میں ایک ہلکا سا جھٹکا تنفس میں ایسا محسوس ہوا جیسے ہچکی آ گئی ہو، چہرے پر دفعتہً خون کی لہر دوڑ گئی، اور طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا، اس وقت شام کے ۶ ر بجے تھے۔ اناللّٰہ وانا الیہ راجعون

اگلے دن صبح ۸ ر بجے کے بعد غسل دینا شروع ہوا اور نماز جنازہ حضرت ڈاکٹر عبدالحئ صاحب نے پڑھائی اور تدفین علامہ شبیر احمد عثمانی کے قریب عمل میں آئی۔

زعمائے قوم وملت کے تأثراتی کلمات

شیخ ابوالخیر سفیر شام- ہم کو علامہ کی موت سے دکھ ضرور ہوا، لیکن اس سے کہیں زیادہ

اس کا دکھ ہوا کہ جو علوم وفنون ان کے سینے میں تھے، وہ بھی ان کے ساتھ دفن ہو گئے۔

مولانا عبدالشکور لکھنوی- وہ نہ صرف علم وفضل بلکہ زہد وتقوی میں بھی ممتاز درجے کے مالک تھے۔

ڈاکٹر عبدالعلی حسنیؒ- تقریباً ۳۰ رسال علامہ کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا، یہ مدت جتنی بڑھتی گئی اتنی ہی موصوف کے دل میں میری قدر بڑھتی گئی، میں نے ذاتی تعلقات میں انہیں شفیق بھائی پایا تو ندوۃ العلماء کے کاموں میں ان کی راتیں رضائے الٰہی کی طلب پر مبنی پائیں، اگر اختلاف رائے کی کبھی نوبت آئی تو میں نے ایک پابند شریعت اور کریم انسان پایا اور جلد وہ اختلاف رائے اشتراک عمل میں تبدیل ہو گیا۔

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے فرمایا- مرحوم مشرقی اور اسلامی لٹریچر کے ایک مقبول ترین اور تسلیم شدہ عالم تھے، اور اس کے لیے انہوں نے عظیم ترین خدمات سرانجام دی تھیں، جدوجہد آزادی کے دوران قوم پرستانہ نظریات اور خیالات کے دل وجان سے حامی تھے۔

بصیرت لاہور ۵۲ء- عہد حاضر کے فرزندان اسلام جن ممتاز اور نامور ہستیوں اور ان بڑوں پر بجا طور ناز کر سکتے ہیں ان میں سے ایک علامہ سید سلیمان ندوی بھی ہیں، اللہ تعالی حضرت علامہ کے درجات کو بلند فرمائے اور ہمیں اپنے پاک لوگوں کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

والسلام

محمد مسعود عزیزی ندوی

مولانا قاری مفتی محمد مسعود عزیزی ندوی کی

چند اہم تصانیف

سیرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

اس کتاب میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ کی مختصر جھلک اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ زندگی کے چند نمایاں پہلو امت کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، کتاب مختصر مگر ضروری واہم معلومات پر مشتمل ہے، جس میں ۴۰/صفحات ہیں، قیمت صرف ۲۰/روپئے ہے۔

حیات عبدالرشیدؒ

یہ مغربی یوپی کی مشہور شخصیت، داعی الی اللہ، ناشر رشد وہدایت حضرت الحاج حافظ عبدالرشید صاحب رائے پوریؒ (خلیفہ حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ) کی سوانح حیات ہے، جس میں حضرت حافظ صاحب کی زندگی کے حالات، دعوتی اسفار، صفات وکمالات، اصلاحی کارنامے، مدارس ومساجد کا قیام، واقعات وکرامات، ارشادات وملفوظات، عملیات ومجربات جیسے عناوین شامل ہیں، دعوتی کام کرنے والوں کیلئے خاصے کی چیز ہے، ۳۳۴/صفحات پر مشتمل کتاب کی قیمت صرف ۲۰۰/روپئے ہے۔

تذکرہ حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوریؒ

یہ کتاب حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری کے حالات زندگی اور ان کی دعوتی واصلاحی خدمات اور مدارس ومساجد کے قیام، خصوصیات وملفوظات اور مکتوبات،

معاصر مشائخ وخلفاء کے حالات پر ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے، جو پہلی بار منظر عام پر آئی ہے، ۳۶۰/صفحات پر مشتمل کتاب کی قیمت صرف ۲۰۰/روپئے ہے۔

سیرت مولانا یحییٰ کاندھلویؒ

یہ کتاب شیخ العرب والعجم شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ کے والد گرامی حضرت مولانا محمد یحییٰ کاندھلویؒ کی سوانح حیات ہے، جس میں ان کے خاندانی وآبائی بزرگوں کے حالات، ان کی تعلیم وتربیت، ان کے علمی کارنامے، ان کا تعلیمی وتربیتی طریقہ کار، خصوصیات وجذبات، ان کے معاصر مشائخ، ان کے مخصوص تلامذہ اور ان کے باقیات الصالحات کے تفصیلی حالات ہیں، یہ کتاب ۳۱۲/صفحات پر مشتمل ہے، جس کی قیمت ۱۰۰/روپئے ہے۔

میری والدہ مرحومہ

اس کتاب میں راقم کی والدہ مرحومہ کی زندگی کے نقوش ومعمولات اور راقم کی تربیت کے واقعات، ان کی اولاد اور اہل تعلق کے تأثرات وجذبات اور حضرات علماء کرام کے تعزیتی خطوط ہیں، یہ کتاب ۸۶/صفحات پر مشتمل ہے، جس کی قیمت صرف ۲۰/روپئے ہے۔

مختصر تجوید القرآن

یہ کتاب تجوید پڑھنے والے طلبہ کیلئے نہایت آسان اور مفید ہے، جو ہندوستان وپاکستان کے تجوید وقرأت کے بہت سے مدارس میں داخل نصاب ہے، اس کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں، اکابر کی پسندیدہ کتاب ہے، ۶۴/صفحات پر مشتمل ہے، جس کی قیمت ۱۰/روپئے ہے۔

افکار دل

اس کتاب میں ۳۰/انمول تقریریں ہیں، جن کو پڑھ کر اور سن کر انسان اپنی زندگی میں تبدیلی لاسکتا ہے، موجودہ حالات کے تناظر میں قرآن وحدیث کی روشنی میں زندگی میں جلا بخشنے والے روح پرور مضامین ہیں، جن سے زندگی میں تازگی اور سرور محسوس ہوتا ہے، کتاب ۴۶۰/صفحات پر مشتمل ہے، جس قیمت صرف ۲۰۰/روپئے ہے۔

مدارس کا نظام تحلیل وتجزیہ

خوابیدہ ماحول اور واہی کے اس دور میں بلاکم وکاست اور بلا کسی رورعایت کے مدارس اسلامیہ کی تعلیم وتربیت، علماء اور ائمہ اور مبلغین کے فرائض کی ادائیگی میں پیدا شدہ غفلتوں پر اس کتاب کا ہر مضمون نصیحت آمیز تازیانہ اور ایک خوشبو دار کنول کی حیثیت رکھتا ہے، جو اس پرفتن دور میں کھل کر آیا ہے، بلاشبہ مدارس، مکاتب، مساجد ومراکز کے نظام اور ماحول میں اس کتاب کے مطالعہ سے بہتری اور عمدگی لائی جاسکتی ہے، کتاب کی ضخامت ۱۲۰/صفحات اور قیمت صرف ۲۰/روپئے ہے۔

رہنمائے سلوک وطریقت

یہ کتاب سلوک وطریقت کے سالکین کے لئے بہت مفید ہے، جس میں تصوف اور اس کی اصل، اللہ والوں سے تعلق اور سلوک وطریقت کے اصول اور اخلاق حمیدہ واخلاق رذیلہ اور سلاسل اربعہ کی خصوصیات وتعلیمات پر سیر حاصل بحث کی ہے، صفحات ۶۴/ پر مشتمل اس کتاب کی قیمت ۱۵/روپئے ہے۔

چند مایہ ناز اسلاف قدیم وجدید (دوسرا ایڈیشن)

اس کتاب میں انیس بزرگوں کے حالات ہیں جن کی زندگیاں علمی ودینی خدمات میں گزری ہیں، اور جن کی زندگی کے حالات پڑھ کر خود اپنی زندگی کو قابل تقلید بنایا جاسکتا ہے، یہ کتاب ۲۵۶/صفحات پر مشتمل ہے، جس کی قیمت ۷۰/روپئے ہے۔

مقالات ومشاہدات

اس کتاب میں ۲۷/مضامین شامل ہیں، جو مختلف وقتوں میں لکھے گئے تھے، جن میں مصنف نے اپنی دینی واصلاحی فکر کو دعوتی اور ادبی انداز میں پیش کیا ہے، یہ ایک اچھا علمی اور ادبی تحفہ ہے، اس کتاب میں ۲۴۸/صفحات ہیں جس کی قیمت ۶۰/روپئے ہے۔

مکتوبات اکابر

سماجی اور دینی تعلقات کی صورت میں ایک کو دوسرے سے ملاقات کرنے اور زندگی کے انفرادی یا دینی معاملات میں مشورہ کرنے اور مشورہ لینے کی ضرورت ہوتی ہے، یہ ایک انسانی اور اہم ضرورت ہے، خط لکھنے والے ادیب ہوتے ہیں تو ان کے خطوط سے ادبی فائدہ بھی اٹھایا جاسکتا ہے، یہ ادب میں اس کی ایک قسم قرار پائی ہے، اس کتاب میں قریب کے زمانے کے ۲۰/بزرگوں کے خطوط ہیں، اس لئے یہ کتاب اکابرین کی دعاؤں کا بہترین مجموعہ ہے، جس کی قیمت صرف ۵۰/روپئے ہے، یہ کتاب ۱۴۸/صفحات پر مشتمل ہے۔

ملنے کا پتہ

مرکز احیاء الفکر الاسلامی مظفر آباد، ضلع سہارنپور (یوپی)
Mob. 09719831058
E-mail: masood_azizinadwi@yahoo.co.in